 

15-08-2016

سیاپا فروش

مفتی منیب الرحمٰن

"سیاپا" پنجابی زبان میں مصیبت کو کہتے ہیں۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ہمارے سینیئر اینکر پرسن اور تجزیہ نگار جناب نصرت جاوید 2008 تا 2013 کے زمانے میں الیکٹرانک میڈیا کے اپنے اُن بعض پٹی بند یعنی ہم پیشہ بھائیوں کو سیاپا فروش کہتے اور لکھتے تھے، جو ہر روز سرِ شام ایسا سماں باندھتے ہیں کہ لگتا کل صبح تک یہ حکومت رخصت ہوجائے گی اور ان کی مَن پسند تبدیلی آجائے گی۔ لیکن جنابِ آصف علی زرداری نے اور کوئی کمال دکھایا ہو یا نہ، یہ کمال ضرور دکھادیا کہ انتہائی صبر وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے جمہوری نظام کے تسلسل کو جاری رکھا اور اگلے دورانیے کے لیے اپنے جانشینوں کو پُرامن طریقے سے اقتدار منتقل کردیا۔ اس مہم کو سر کرنے کی خاطر نظام میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں، اُس کا خمیازہ انہیں 2013 کے انتخابات میں شکست کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ ایک دور ایسا آیا کہ بعض مخالف چینلز پر انہوں نے اپنی پارٹی کے ترجمان بھیجنے اور اپنا دفاع کرنے سے بھی روک دیا۔ وہ ہر روز سرِ شام انقلاب کی بشارت سنانے والے اور اپنے الفاظ کی چاند ماری سے اہلِ اقتدار کو رخصت کرنے کا خواب دیکھنے والے اینکر پرسنز کو سیاسی اداکار کہتے تھے اور انہیں وہ ٹھنڈے پیٹوں بھگتتے بھی رہے۔ ہمارے ممدوح جنابِ شیخ رشید احمد کا دَم غنیمت ہے کہ ٹیلی ویژن چینلوں کی اسکرین پر رونق قائم کر رکھی ہے اور بعض اوقات ایک ہی وقت میں وہ تین تین اینکر پرسنز کو انگلی پکڑ کر چلاتے رہتے ہیں۔ ہمارے کراچی کے کاروباری لوگوں کی زبان میں کاروباری شراکت کو "پتّی" بھی کہتے ہیں۔ میری بھی پتّی رکھ لو کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے اپنے کاروبار میں شراکت دار بنادو۔ سو جناب شیخ رشید احمد اگر ٹیلی ویژن چینلز کے بڑے بڑے پیکج والے ان مایہ ناز اینکر پرسنز سے "پتّی" کا مطالبہ کریں تو وہ بجا طور پر اس کے حق دار ہوں گے اور اب تو قصاص واحتساب کی دو تحریکات کو سرگرم رکھنے کے لیے ان کی مصروفیات اور بڑھ گئی ہیں۔ 2002 میں اُس وقت کے صدر جناب جنرل (ر) پرویز مشرف کو ایک تابعِ فرمان وزیرِ اعظم کی تلاش تھی اور متوقع فہرست میں جنابِ مخدوم امین فہیم مرحوم بھی تھے۔ چنانچہ ایک رات دامنِ کوہ کے ہوٹل میں اُن کی ملاقات رپورٹ کی گئی، جنابِ مخدوم نے اپنی وضاحت میں کہا: "اتفاقیہ ملاقات تھی"، اِس پر جنابِ حافظ حسین احمد نے پھبتی کسی کہ بالکل درست: اتفاقیہ ملاقات تھی، کیونکہ اس پر دونوں کے مابین پہلے ہی اتفاق ہوچکا تھا۔ سو ایسا ہی اتفاق ان تحریکات میں بھی ہوجاتا ہے۔

بچپن میں ہم نے ایک لطیفہ سنا تھا کہ ایک ننھا منا نر چڑا درخت کی شاخ پر بیٹھا پسینے پسینے ہو رہا تھا، اُس سے کسی نے پوچھا: تم پر کونسی اُفتاد آن پڑی ہے کہ پسینے میں شرابور ہو رہے ہو؟۔ اُس نے اپنی پشت سے ٹکراتے ہوئے درخت کے پتے کی طرف اشارہ کر کے کہا: دیکھتے نہیں ہو میں نے آسمان تھام رکھا ہے۔ سو ہمارے نصرت جاوید صاحب کے سیاپا فروش دوستوں کا دَم غنیمت ہے کہ

انہوں نے آسمان تھام رکھا ہے، ورنہ نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا۔ اکثر نے ایک پوزیشن اختیار کر لی ہے اور اُس کے مطابق منطق کے مقدمات (صغریٰ و کبریٰ) ترتیب دیتے ہیں اور مَن پسند نتیجہ نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ بعض حضرات روز سرِ شام بشارتیں (Glorious News) سناتے ہیں اور وعیدوں (Threateing News) سے ڈراتے ہیں اور خواب و خیال کی دنیا میں انقلاب برپا کیے رہتے ہیں۔

ہر صاحبِ نظر کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی فکری دیانت کے مطابق کسی کو ترجیحِ اول کے درجے میں رکھے یا مردود قرار دے۔ لیکن توازن اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ تمام نوجوان پر جوش لکھاریوں کو اس عاجز کا مشورہ یہ ہے کہ صحافت کے میدان میں آپ کی سب سے بڑی متاع آپ کی اپنی ساکھ، وقار اور اعتبار ہے، جسے انگریزی میں Credibility کہتے ہیں۔ چونکہ آپ نے اس میدان میں رہنا ہے اور یہ آپ کا ذریعۂ معاش بھی ہے، لہٰذا اس بازار میں آپ کی قدر و قیمت کے تعیُّن کی کسوٹی یہ ہے کہ آپ قارئین، سامعین اور ناظرین کے نزدیک کتنے مستند، ثقہ اور قابلِ اعتبار ہیں۔ اس میدان میں بلند مقام پانے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک کی پگڑی اچھالی جائے، ہر ایک کی عزت سے کھیلا جائے، اپنے اور اپنے ممدوح کے سوا سب کو بے توقیر سمجھا جائے، آپ کے بولے ہوئے لفظ اور لکھے ہوئے حرف کا وزن دلیل و استدلال کے معیار پر پورا اترنے سے بنتا ہے۔ ہماری تو خواہش اور دعا ہے کہ ہماری سیاست اور صحافت میں اَقدار فروغ پائیں۔ ہم سب باہمی احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے اتفاق یا اختلاف کریں اور کسی کی توہین، تحقیر اور تذلیل نہ کریں۔ عربی زبان کا محاورہ ہے: ''مَنْ وَقَّرَ وُقِّرَ''، یعنی جس نے دوسروں کی عزت کی، دراصل اُس نے خود عزت پائی۔

جب پاکستان میں صحافت اخبارات تک محدود تھی، دولت کی ریل پیل نہیں تھی، بڑے بڑے ناقابلِ یقین پیکج بھی نہیں تھے، معاش کے ساتھ ساتھ کسی حد تک مشن بھی تھا۔ اگر تقسیم تھی تو شخصی وابستگی کی بنیاد پر نہیں بلکہ نظریات کی بنیاد پر تھی۔ اُس زمانے میں دائیں بازو اور بائیں بازو کی اصطلاحات رائج تھیں، کہا جاتا تھا کہ کسی کا قبلہ ماسکو اور بیجنگ ہے اور کسی کا لندن اور واشنگٹن ہے۔ ایک دوسرے پر طنز و تعریض بھی ہوتی تھی، لیکن کسی نہ کسی درجے میں باہمی احترام بھی ملحوظ رہتا تھا۔ بیسویں صدی کے ساتھ ستر کے عشرے تک اگر اخبار میں کسی کے خلاف چند سطریں چھپ جاتیں تو ہلچل مچ جاتی اور اُس کے اثرات اقتدار کے ایوانوں میں بھی محسوس ہوتے تھے۔ آج کل اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلز کی کثرت کے سبب لکھے ہوئے حروف اور بولے ہوئے الفاظ کی وہ اہمیت و تاثیر نہیں رہی۔ غالب نے کہا تھا:

رنج سے خُوگر ہُوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج ۔۔۔ مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی، کہ آساں ہو گئیں

اور غالب ہی نے کہا ہے کہ

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا ۔۔۔ درد کا حد سے گزرنا ہے، دوا ہو جانا

سو ٹیلی ویژن چینلز پر سیاسی مباحثوں کی کثرت اور اخبارات میں آرٹیکلز کی بھرمار نے اہلِ اقتدار کے لیے بہت حد تک مشکلات کو آسان کر دیا ہے، درد حد سے گزر کر خود دوا بن گیا ہے اور اب کافی حد تک راوی چین لکھتا ہے۔ ہر چند کہ ہم اپنے لکھے ہوئے حرف کو نشتر اور بولے ہوئے لفظ کو تیر سمجھیں، مگر یہ ہتھیار اب کند ہوتے جا رہے ہیں۔ دعا کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے

کلام کی بے تاثیری کو شاعر نے ان کلمات میں منظوم کیا ہے:

آخر تو دشمنی ہے دُعا کو اثر کے ساتھ　　مانگا کریں گے اب سے دُعا ہجر یار کی

حالانکہ الفاظ کی اثر آفرینی کے بارے میں کسی زمانے میں عربی کے ایک دانا شاعر نے کہا تھا:

جَرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامُ　　وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

ترجمہ:''تیر کے لگے ہوئے زخم تو پھر بھی (وقت گزرنے کے ساتھ) مندمل ہو جاتے ہیں، لیکن زبان کا زخم (آسانی سے) مُندمل (Heal Up) نہیں ہوتا''۔ پس وقت آ گیا ہے کہ اگر ہم اپنے قاری اور ناظر کو اپنے ساتھ جوڑے رکھنا چاہتے ہیں تو اپنے رویے اور اندازِ تحریر و تقریر میں توازن پیدا کریں، تنقید اور تنقیص و توہین میں فرق کو سمجھیں۔ اگر کوئی کسی کے ایجنڈے پر بھی کام کر رہا ہے تو اپنے مُربّی اور ولی نعمت کے مقصد کو حکمت سے بات کر کے ہی حاصل کر پائے گا، شوروغوغا اور بے مقصد الزام تراشی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، بلکہ یہ حربے انگریزی کی اصطلاح میں Counter Productive یعنی منفی نتائج کی حامل ہوں گے۔ ہمارے آزاد الیکٹرانک میڈیا کی عمرِ عزیز اب سولہ سال ہو چکی ہے، لہٰذا ہمارے رویّوں میں پختگی (Maturity) آنی چاہیے۔ ہمارا یہ مشورہ مذہبی طبقات کے لیے بھی ہے کہ تمام مسالک کے بیشتر مقبولِ عام خطباء کا شِعار خطابت منفی ہوتا ہے، وہ طنز، تعریض، توریہ اور ایہام کے فن کو استعمال کرتے ہوئے دوسروں کی تذلیل کرتے ہیں۔ اس لیے میں اس بات کا اعادہ کرتا رہتا ہوں کہ ہمیں دوسروں کی خامیوں پر جینے کی بجائے اپنی خوبیوں پر جینے کا سلیقہ اختیار کرنا چاہیے۔ زبان اور قلم کا استعمال انتہائی محتاط انداز میں کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان بھی یہی ہے: (1) ''اور جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اُس پر لازم ہے کہ اچھی بات کہے یا (دوسروں کے لیے اذیت رسانی کی بات کہنے کی بجائے) خاموش رہے، (صحیح البخاری:6018)''۔ (2): ''اچھی بات کہنا (بھی) صدقہ ہے، (مسند احمد:8111)''۔ (3) ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: رسول اللہ ﷺ کا اندازِ گفتار (اتنا وقار، متانت اور ٹھہراؤ والا تھا) کہ ہر لفظ جدا جدا معلوم ہوتا (جیسے موتی ترتیب سے جڑے ہوئے ہوں)، جو بھی اُسے سنتا، پوری طرح (اُس کے مفہوم کو) سمجھ لیتا، (سنن ابوداؤد:4839)''۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، پھر جو کچھ خرچ کریں اُس پر احسان جتاتے ہیں نہ تکلیف پہنچاتے ہیں، اُن کے لیے اُن کے رب کے پاس اُن کا اجر ہے اور نہ اُن پر کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے، (لوگوں سے) اچھی بات کہنا اور (اُن کی خطا سے) درگزر کرنا اُس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد تکلیف پہنچے، اور اللہ بے نیاز اور بہت بردبار ہے، اے ایمان والو! احسان جتا کر اور اذیت پہنچا کر اپنے صدقات کو ضائع نہ کرو، (البقرہ:64-262)''۔ سو اذیت رسانی انسان کی کمائی ہوئی نیکی سے اللہ کی راہ میں خرچ کیے ہوئے اپنے مال کے اجر سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ اسی طرح دینِ اسلام نے بدگمانی، بہتان تراشی، عیب جوئی، غیبت، تمسخر اڑانے اور طعن و تشنیع سے بھی منع فرمایا ہے۔ سورۃ الحجرات کے دوسرے رکوع، سورۃ الہمزہ اور سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات میں اخلاقیات کے مسائل کو تفصیل سے بیان فرمایا گیا ہے اور ویسے تو قرآنِ مجید میں جا بجا ان باتوں کی تاکیدات، تنبیہات اور وعیدیں مذکور ہیں۔

(روزنامہ دنیا، 15 اگست 2016ء)